ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ایمان کیا ہے؟

یہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب مرحوم کا آخری مضمون ہے جو انہوں نے وفات سے ایک ہفتہ قبل ثقافت کے لیے لکھا تھا افسوس ہے کہ اس کی دوسری قسط مکمل نہ ہو سکی یہ مضمون لکھنے سے قبل انہوں نے کچھ عنوانات قلمبند کیئے تھے جن سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس مقالہ میں کیا کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ عنوانات کی یہ فہرست مضمون کے آخر میں درج کر دی گئی ہے۔

انسان کی گوناگوں منطقی، غیر منطقی اور نفسیاتی تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک عام تعریف جو منطق کی کتابوں میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ نطق میں گویائی بھی داخل ہے اور عقل بھی۔ عام طور پر اس کے معنی عقل والا حیوان لئے جاتے ہیں لیکن انسان کی زندگی میں غیر عقلی عناصر اور محرکات اتنے کثیر اور شدید ہیں کہ اب جدید نفسیات اس کو حیوانِ عاقل کہنے سے گریز کرتی ہے اور یہ تعلیم دیتی رہی ہے کہ انسان وہ حیوان ہے جو اپنی جبلّی خواہشوں اور غیر شعوری میلانات کو عقل و استدلال کا لباس پہنا کر اپنے افعال کو عاقلانہ ثابت کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت کوئی اور حیوان نہیں کرتا۔ اس لیے یہ انسان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انسان کی اور بھی بہت سی امتیازی خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں جو اور حیوانوں میں نہیں پائی جاتیں مثلاً یہ کہ انسان ہنسنے والا حیوان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان رونے والا حیوان ہے کیونکہ دوسرا کوئی حیوان نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے۔ انسان کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ آگے اور پیچھے دیکھنے والا جانور ہے۔ حافظہ انسان کے ماضی کو عالم شعور میں حال بنا دیتا ہے اور اس کے اکثر افکار و افعال کا رخ قریب یا بعید مستقبل کی طرف ہوتا ہے۔ زندگی اپنے ادنیٰ مظاہر میں بھی یہاں تک کہ نباتی اور حشراتی دور میں بھی مقصد کوش ہے لیکن انسانیت کی سطح سے نیچے یہ مقصد غیر شعوری ہوتا ہے جیسا کہ درخت کی شاخیں نور و نارِ آفتاب کی جویا ہو کر بلند ہوتی ہیں یا اپنا رخ بدلتی ہیں۔ جانوروں کی حیرت انگیز اعمال و افعال مقصد کوشی بھی زیادہ تر جبلّی اور غیر شعوری ہوتی ہے لیکن مستقبل کا کوئی تصوری نقشہ سامنے رکھ کر اس کی طرف کوشش کی باگوں کو موڑنا انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

انسان کی ایک اور تعریف بھی ہو سکتی ہے جو کہیں میری نظر سے نہیں گزری لیکن میرے ذہن میں اکثر گزری ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان "پرستش کرنے والا" حیوان ہے۔ کسی اور حیوان میں یہ جبلت دکھائی نہیں دیتی۔ وحشت کے ادنیٰ ترین ادوار سے لے کر تہذیب و تمدن کی حیرت انگیز بلندیوں تک ہم اسے کسی نہ کسی چیز یا مخلوق کی پوجا ہی کرتے دیکھتے ہیں۔ وہ

کبھی موجود کی پوجا کرتا ہے اور کبھی موہوم کو تصور میں موجود بنا کر پوجتا ہے۔ انسان اپنی تمام زندگی میں بیم و رجا کا شکار رہتا ہے کبھی وہ طبیعی فطرت کے مظاہر سے خائف ہو کر ان کے شر سے بچنے کی کوشش میں ان کی پوجا کرتا ہے اور کبھی خواہشیں اور امیدیں اس کے لیے معبود تراشتی ہیں۔ اس سے کسی قدر ملتی جلتی انسان کی ایک یہ تعریف بھی ہو سکتی ہے کہ انسان صاحب ایمان ہستی ہے۔ انسان کی یہ تعریف بھی کہیں نظر سے نہیں گزری مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تعریف بھی اس کی اساسی فطرت کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ یہ خیال کسی قدر وضاحت طلب ہے۔

ایمان کا ایک صحیح اور سادہ مفہوم یہ ہے کہ کسی ایسی حقیقت کو سچ ماننا جو نہ صرف کسی فرد کے انفرادی تجربے سے متجاوز اور اس کے محسوسات سے ماورا ہو بلکہ اجتماعی طور پر وہ حقیقت کسی کا حسّی تجربہ نہ ہو۔ مختصراً یوں کہیئے کہ ایمان کے مفہوم میں لازماً یہ امر داخل ہے کہ ایمان کسی قسم کا بھی ہو وہ ایمان بالغیب ہوتا ہے۔ انسان صرف آگے پیچھے دیکھنے والا حیوان ہی نہیں بلکہ ماورائے تجربہ حقائق کو تسلیم کرنے والا حیوان ہے۔ طرح طرح کے معبود بھی وہ اسی جذبۂ ایمانی کی وجہ سے تراشتا ہے اور طرح طرح کے مقاصد و غایات و نصب العین بھی وہ اسی میلان کی بدولت بناتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ محض حاضر سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور کسی ایسی صورتِ حال کا آرزومند رہتا ہے جو ابھی پردۂ غیب اور کتم عدم میں ہے لیکن یہ آرزو اس کو کبھی سہارا نہ دے سکے اگر اس کے متحقق ہونے کا یقین اس کے ساتھ وابستہ نہ ہو۔ انسان ایسی آرزوؤں کے صورت پذیر ہونے پر بھی ایمان لاتا ہے جن کے پورا ہونے کے لیے کوئی اسباب موجودہ حالت میں دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن انسانی ارتقا کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ اسباب ایمان پر مقدم نہ تھے بلکہ ایمان کے استقلال اور اس کی استواری نے اسباب مہیا کر دیئے۔ اس لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایمان ایک تخلیقی قوت ہے۔

ہم نے انسان ہی کو صاحب ایمان ہستی کہا ہے لیکن اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ حیوانی زندگی میں بھی ادنےٰ سے اعلےٰ کی طرف ارتقا ایمان ہی کی بدولت ہوا ہے۔ زندگی کبھی مادی اسباب و آلات سے پابزنجیر اور میکانکی علت و معلولی کے زنداں میں اسیر نہیں رہی۔ حیاتیات میں جن علماء نے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا ہے ان میں سے بعض اس کے قائل ہیں کہ حشرات و چرند و پرند میں بھی ارتقائے حیات نے جو انقلابی قدم اٹھائے ہیں ان کی وجہ بعض خارجی اسباب کا جمع ہونا یا ماحول کی فیاضی نہ تھی بلکہ اس امر پر غیر شعوری ایمان تھا کہ بلند تر زندگی ممکن الوجود ہے۔ اسلامی تاریخ میں ارتقائے حیات کے مبلغوں میں سب سے بڑھ کر عارف رومی ہیں جنہوں نے وضاحت کے ساتھ یہ نظریہ پیش کیا کہ زندگی کسی مرحلے میں بھی قالب کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ روحِ حیات خود قالب آفریں ہے۔ ع قالب از ما ہست شد نے ما ازو۔ بلند اور بہتر زندگی پر ایمان جانوں میں قوتِ خلاقی پیدا کرتا اور آرزوئے مستور کو سطحِ ظہور پر لاتا ہے۔ مادّے سے انسان تک جو قوتِ زندگی کو اوپر ابھارتی چلی آئی ہے اسے وہ عشق کہتے ہیں۔ یہی عشق وجدانِ حیات

بھی ہے اور ایمانِ حیات بھی۔ مادے کو حیاتِ نباتی کا کچھ تجربہ نہ تھا لیکن اس کا جذبۂ ارتقا ایمان آفرین تھا کہ بلند تر ہستی سے رابطہ پیدا کر کے میں وہ کچھ ہو سکتا ہوں جو ابھی میرے وہم و گمان میں نہیں آتا لیکن ایسا ہونا یقینی ہے۔ مولانا روم نردبانِ حیات پر پایہ بہ پایہ چڑھتی ہوئی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ ایمان رکھتے ہیں کہ ع آنچہ اندر وہم نایداں شوم۔ جس ہستی نے بھی حیاتِ حاضرہ کو اپنی منزل سمجھ لیا اور آئندہ کے ناقابلِ بیان ممکنات کو موجود بنانے پر یقین نہ کیا ایمان کی کمزوری کی وجہ سے اس کی ترقی رک گئی۔ عارفِ رومی نے کئی مرتبہ اس ایقان کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ انسان بھی ایک عبوری مخلوق ہے یا حیوانیت اور فوق الانسان کی طرف عبور کرنے کے لیے ایک پل ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ہمیں تو یہ فوق الانسان نہ کہیں نظر آتا ہے اور نہ اس کا کوئی تصور ہمارے ذہن میں آسکتا ہے تو اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ موجودہ انسانی زندگی میں جو صورتِ حیات ابھی متحقق نہیں مجھے اس کی آرزو ہے اور اس کے متحقق ہونے پر ایمان رکھتا ہوں:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

مولانا نے کئی جگہ اس کی تشریح کی ہے کہ زندگی کی وسیع تر اور بلند تر سطح کا کوئی واضح تصور اس بلند تر سطح پر پہنچے کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال عارفِ رومی نے یہ دی ہے کہ رحم کے اندر اگر جنین محض اپنے موجودہ تجربہ سے استدلال کرے تو اس کے لیے اس حقیقت کا قائل ہونا محال ہو کہ شکمِ مادر سے باہر ایک عظیم الشان عالم اور حیات لامحدود و گوناگونی کی دنیا ہے جس کے مقابلے میں میں موجودہ حالت میں ایک تنگ و تاریک زنداں میں مقید ہوں۔ نو مہینے اسی زنداں میں بسر کر چکنے کے بعد وہ کسی تجربے اور استدلال کی بدولت باہر نہیں آتا بلکہ زندگی کی وسعت کوشی کا ایک ایمانِ مضمر اس کو وسیع تر عالم میں لے آتا ہے جہاں پہنچ کر تجربہ اس غیر شعوری ایمان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس سے مولانا یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ زمان و مکان کا عالم، یہ عالمِ رنگ و بو، یہ جہانِ آب و گل اپنی وسعتوں، رنگینیوں اور دلآویزیوں کے باوجود ایک رحم ہے جس کے اندر انسانی جانیں پرورش پاتی ہیں لیکن یہ ٹھیرنے کا مقام نہیں سرائے سرِ راہگذار ہے۔ منزلِ مقصود نہیں۔ محض استدلال سے اس سے بالاتر عالم کا نہ ثبوت مل سکتا ہے اور نہ کوئی تصور حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن انسانی روح کے اندر یہ ایمان مضمر ہے کہ حیاتِ لامتناہی کو نہ زمان و مکان مقید کر سکتے ہیں اور نہ مظاہر کی علت و معلول کی زنجیریں۔ زمان و مکان کی ماہیت پر غور کرنے والا نفس خود اس زنداں میں محبوس نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا ہے کہ اے معشرِ جن و انس تم ان حدود و قیود سے باہر نہیں نکل سکتے،

یٰمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت والارض فانفذوا، لا تنفذون الا بسلطان۔

یعنی گروہ جن وانس اگر تم میں یہ سکت ہے کہ تم آسمانوں اور زمین کے حدود سے باہر نکل جاؤ تو یہ کوشش بھی کر دیکھو۔ تم کسی "سلطان" کے بغیر باہر جا ہی نہیں سکتے۔

یہ قوت یہ سلطان قید شکن وہی چیز ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ اسی سلطانِ ایمان کی بدولت قیودِ جمادی سے نکل کر حیاتِ نباتی میں داخل ہوتی ہے جہاں گِل مبدل بہ گُل ہوتی ہے۔ مٹی محض اپنی جمادی قوت سے کبھی گُل نہ بن سکتی اگر مٹی محض مادی اسباب کے مہیا کرنے میں لگی رہتی اور اس کے اندر ممکن کو موجود کرنے کا ایمان اور میلان نہ ہوتا تو ابداً لآباد تک جماد جماد ہی رہتا۔ اس جمود سے نکالنے والی قوت مٹی کا وہ ایمان ہے جس نے فقط موجودہ اسباب پر قناعت نہیں کی بلکہ بلند تر زندگی کے لیے اسباب و آلات و حالات پیدا کیے۔ اس نظریۂ حیات کے وہ حکما بھی قائل ہیں جنہوں نے زمانۂ حال میں انیسویں صدی کی گمراہ کن مادیت اور میکانیت کی تردید کر کے روحِ انسانی کے لیے آزادی کی راہیں کھولیں۔ اتفاقی طور پر وظائفِ اعضا کی تبدیلیوں سے جگنو نے اپنا چراغ نہیں جلایا بلکہ تاریکی شب میں راستہ ڈھونڈنے کی تمنا کی شدت نے یہ برقی بیٹری کرمک بے مایہ کے اندر پیدا کر دی سمندر کی تاریکیوں میں بھی کئی مچھلیاں خود اپنے نور کی روشنی میں اپنی زندگی کا کاروبار کرتی ہیں۔ علامہ اقبال انسان کو خودداری کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

تا کجا طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم
اپنی مٹی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

یہ کام وہی ہے جو جہیں کے جگنو اور سمندر کی بعض مچھلیاں انسان سے بہت پہلے کر چکی ہیں اور اس اشرف المخلوقات کے لیے سبق آموز ہیں۔ اس خیال کو کہ زندگی حالات اور آلات کی محتاج نہیں بلکہ خود ان کی آفرینش کرتی ہے حکیم ملت نے کس عمدگی سے اس شعر میں ادا کیا ہے

کبک پا از شوخیٔ رفتار یافت
بلبل از ذوقِ نوا منقار یافت

بلبل کی منقار اور اس کے گلے کے ساز نے نغمہ آفرینی نہیں کی بلکہ شدتِ ذوقِ سرود نے یہ ساز مہیا کر دیا ہے چکور کو ذوقِ رقص نے موزوں قسم کے پاؤں عطا کیے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ پاؤں کی خاص ساخت کی وجہ سے وہ رقص کرنے لگا ہے۔ اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کی قوت ہی زندگی کی تخلیقی قوت ہے۔ جمادات سے لے کر انسان تک اس کا ایک ہی قانون ہے اگرچہ اس قانون کے اطلاق میں تنوع اور مسلسل بڑھتی ہوئی وسعتیں اور بلندیاں پائی جاتی ہیں

ایمان کی ماہیت ہی میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اس حقیقت کا ایقان ہے جو عالمِ شہادت کے مقابلے میں ابھی تک عالمِ غیب میں ہے۔ اس کی ضد کفر ہے جس کا مفہوم عالمِ غیب کا انکار ہے۔ قرآن کریم میں آدم و ابلیس کا قصہ درحقیقت ایمان و کفر کی تفریق کی وضاحت ہے۔ خدا نے آدم کو مٹی سے بنایا ابتدا سے آج تک جتنے

انسان ہیں وہ سب مٹی ہی کے بنے ہوتے ہیں۔ گوشت، پوست، ہڈی، خون، سب مٹی ہی کے عناصر کی مختلف صورتیں ہیں۔ تمام غذا مٹی سے پیدا ہوتی ہے۔ مٹی نباتات بنتی ہے اور نباتات کو حیوانات بدن کے اجزا میں تبدیل کرتے ہیں۔ انسان جب سبزی کھاتا ہے یا گوشت کھاتا ہے تو یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ خاک کا پتلا خاک ہی کھا رہا ہے۔ اس مٹی کے بت کے اندر خلاق فطرت نے اپنی روح حیات پھونک دی نفخت فیہ من رّوحی جس کی بدولت لامتناہی زندگی کے ممکنات اور لامحدود قوتیں اس کے اندر مضمر ہو گئیں جس طرح کہ ایک ثمر آور درخت اپنے چھوٹے سے بیج میں مضمر ہوتا ہے۔ ملائکہ ملکات حیات کی مختلف صورتوں کا نام ہے۔ ملک اور ملکہ کا لفظی مادہ ایک ہی ہے عارف رومی نے اپنے ملفوظات "فیہ ما فیہ" میں ملائکہ کو اس عقل کل کی متنوع صورتیں قرار دیا ہے جن کی بدولت حیات کائنات کا نظم و نسق قائم ہے۔ اس کی مثال انہوں نے یہ دی ہے کہ موم سے کئی طرح کے پرندے بنا سکتے ہیں لیکن اگر ان سب کو پگھلا دیا جائے تو محض موم کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ ان کی صورتیں محض اعراض تھے جن کا جوہر فقط موم تھا۔ قصۂ آدم میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ملائکہ کو حکم ہوا کہ تم اس نو آفریدہ مخلوق کے آگے سر تسلیم خم کرو۔ خدا کے مطیع تو تم ہو ہی لیکن اب بحکم خدا اس کی بھی اطاعت کرو جس میں روح الٰہی پھونکی گئی ہے۔ اس مخلوق کی تقدیر یہ ہے کہ وہ اس عالم ارضی میں نائب حق ہو۔ نائب حق کی اطاعت حق کی اطاعت کے منافی نہیں بلکہ بحکم حق لازم ہے۔ آدم کو ذی اختیار ہستی بنانے کا ایک ناگزیر نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اس اختیار کا غلط استعمال کرے اور اسے تعمیر حیات کی بجائے تخریب میں صرف کرنے لگے۔ ملائکہ یا فطرت کی قوتوں کو انسان کا یہ پہلو دکھائی دیا کہ یہ فساد پیدا کرے گا اور خون ریزی کرے گا اور اس حالت میں بندۂ فرماں بردار نہ ہوگا۔ انسان کی فطرت کا یہ پہلو بھی ایک حقیقت ہے اس لیے ملائکہ کو جو کچھ اس کے اندر نظر آیا وہ بھی صحیح تھا۔ مگر غلطی اس میں یہ تھی کہ

عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

آدم کے علم و ہنر کے پہلو فطرت مجبور کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ آفرینش آدم کے بلیغ اشعار میں علامہ اقبال نے اس خیال کو موثر انداز میں بیان کیا ہے

فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد

دور آدم سے قبل کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہ تھی جسے اپنے آپ کو بنانے اور بگاڑنے کا اختیار ہو۔ بالفاظ دیگر وہ ایک حد تک اپنی تقدیر کی معمار ہو۔ کسی مخلوق میں اپنی ذات کا شعور بھی نہ تھا۔ حسب ضرورت شعور ماحول جانداروں میں پایا جاتا تھا لیکن اس سے آگے نہ شعور ذات تھا اور نہ شعور حق۔ ابتدائی آشفتگی کے بعد فطرت کی قوتوں نے اطاعت آدم اس لیے قبول کر لی کہ علم اشیا و حوادث کی بدولت اس کا مسخر کائنات ہونا ان پر آشکار ہو گیا۔ تسخیر فطرت انسان

کا مخصوص وظیفۂ حیات اور وجہِ تکریمِ آدم ہے۔

فطرت کی قوتیں اس کی عظمت پر ایمان لے آئیں لیکن ابلیس کافر ہو گیا۔ اس کفر کی ماہیت بھی قرآن کے قصۂ آدم سے آشکار ہوتی ہے۔ اس قصے میں ابلیس اس مادیت کا نمائندہ ہے جس کو مادے کی ترکیبات کے اندر مادی عناصر سے زیادہ کوئی مستقل جوہرِ حیات نظر نہیں آتا۔ قرآن کا ابلیس مظاہر پرست ہے اس نے آدم کو فقط اسی نظر سے دیکھا کہ وہ محض مٹی کا ایک پتلا ہے۔ اس بے حقیقت مخلوق کو مسجودِ ملائک ہونے کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا۔ آج بھی جو حکیم طبیعی مادیت اور میکانیت کے باطل فلسفے کا شکار ہے وہ انسان کو عناصرِ ارضی کا ایک اتفاقی مجموعہ و مرکب سمجھتا ہے۔ وہ اس کے اندر حیاتِ حیوانی کے علاوہ کسی ایسی روح کا قائل نہیں جو مادی قوتوں کی پیداوار نہیں بلکہ علم و عمل کی بدولت ان کی مسخر اور نفخۂ الٰہی کی بدولت لامتناہی قوتوں کی حامل ہے۔ وہ روح کی آواز کو جسم کے ساز کی آواز سمجھتا ہے جو ساز کے ٹوٹنے پر خاموش ہو جائے گی یا چراغ بدن کے تیل کی عارضی روشنی ہے جو چراغ کے ٹوٹنے یا تیل کے ختم ہونے پر ہمیشہ کے لیے بجھ جائے گی۔ گویا بندروں کی ایک ترقی یافتہ نوع ہے جس نے بندروں سے زیادہ ذہین ہو کر بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے آلات بنا لئے ہیں۔ مادہ پرست کو اس کے اندر کوئی ابد قرارِ حیات نظر نہیں آتی۔ اکبر الٰہ آبادی نے باندازِ ظرافت کیا حکیمانہ بات کہی ہے

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں
سن کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

قرآن نے مظاہر پرستی اور مادہ پرستی ہی کو باندازِ ابلیس پیش کیا ہے جس کو تکریمِ آدم کے وجوہ نظر نہیں آ سکتے۔ اس کا استدلال مادہ پرستی کے اندر محصور ہے اس لیے کہ آدم بس خاک کا پتلا ہے۔ آدم کا مرئی مظہر یقیناً خاکی تھا۔ اس کے لامتناہی امکانات پر یقین ایمان کا متقاضی تھا جو ابلیس میں پیدا نہ ہو سکا۔ اس کے معلومات سب ادراکاتِ حاضرہ کی بدولت تھے۔ حاضر سے غیب کی حقیقتوں کی طرف عبور کرنے کی صلاحیت اس میں نہ تھی۔ جس کو مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایمان سے عاری تھا۔ ابلیس ایک تمثیل ہے اس محصور و محدود نظر والے انسان کی جو زندگی کی لامتناہی مضمریت اور اس کی لا محدود ارتقائی قوتوں کا قائل نہیں۔ مادہ پرستی حاضر پرستی ہے وہ اس امر کا انکار ہے کہ ہر حالت میں غیب حاضر کے مقابلے میں وسیع تر ہے۔ مزید برآں انفس و آفاق دونوں میں غیب حاضر کے مقابلے میں کشافِ حقیقت بھی ہے اور بواسطۂ ایمان خلاقِ حیات بھی۔

قصۂ ابلیس و آدم میں اور بھی نہایت اہم اسرارِ حیات پنہاں ہیں۔ فقط مادیت کا قائل اور مظاہر پرست اُن حقائق کی نسبت مائل بہ انکار رہتا ہے جو اس کے ادراکِ حسی کے محدود سانچوں میں نہ ڈھل سکیں۔ طبیعی سائنس

کی ترقی نے حیات و کائنات کا جو غلط نظریہ وضع کر لیا وہ خود انسان کے نفسی حقائق کا بھی منکر ہو گیا کیونکہ نفس کی کوئی مستقل حقیقت مادی مظاہر کی علت و معلول کی کڑیوں میں کہیں نظر نہ آتی تھی۔ مادیت کا مدار ریاضیات پر تھا۔ اس نظریے کے مطابق ہر شے کی حقیقت ریاضیاتی تناسب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس چیز پر ریاضی کا اطلاق نہ ہو سکے وہ محض وہم کی پیداوار ہے۔ مادیت کی بنا پر جو نفسیات لکھی گئی اس نے روح یا نفس کو خارج از بحث کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود وہ شعور بھی بے حقیقت ہو گیا جس نے یہ نظریۂ حقیقت پیدا کیا تھا۔ گویا اس خیال باطل کی بنا پر انسان خود اپنا منکر ہو گیا۔ مادی مظاہر کے تسلسل کا اقرار باقی رہ گیا اور اس کے علاوہ تمام حقائق حیات کے متعلق انکار ہی انکار۔ اس انکار منفی سے ایک چھوٹا پندار پیدا ہوا۔ مادہ پرستی میں عالم کل ہونے کے زعم نے ترقی پذیر معرفت کے دروازے بند کر دیئے۔ قرآن کریم کے ابلیس میں اسی لیے آپ کو انکار اور پندار نظر آتا ہے۔ حقائق نامشہود کا انکار انسان کے نفس کو محدود کر دیتا ہے۔ معرفت حیات کے لیے لازمی ہے کہ انسان حقیقت حیات کی لامحدودیت کا احساس رکھے۔ جو کچھ اب تک معلوم ہوا ہے اس کو نامعلوم کے مقابلے میں نہایت قلیل سمجھے۔ اور رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا کی مسلسل دعا اس کا وظیفہ بن جائے۔ علم کے ساتھ حلم اسی زاویۂ نگاہ سے پیدا ہوتا ہے۔ افلاطون نے کہا کہ علم کی ابتدا حیرت سے ہوتی ہے۔ حیرت انسان کے اندر استفہام پیدا کرتی ہے اور پیدا شدہ سوال کے جواب کے لیے نفس انسانی تجسس، مشاہدے اور استدلال سے کام لیتا ہے۔ زندگی کی نسبت جس شخص کے اندر حیرت پیدا نہیں ہوتی اس کے اندر حکمت کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ حکمت یونانی نے حیرت کی بدولت علم میں ترقی کے بہت سے قدم اٹھائے لیکن وہ علم میں اس فراوانی پر نہ پہنچے جو انسان کو پھر ایک نئی حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اس نئی حیرت ہی سے نئی معرفت کا آغاز ہوتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ عرفی نے اس مضمون کو نہایت بلیغ انداز میں ادا کیا ہے وہ کہتا ہے کہ عوام جن باتوں کو معلوم اور واضح سمجھتے ہیں گویا ان کو جاننے میں کوئی اشکال ہی نہیں ان کے پردے میں بھی پُراسرار حقائق ہیں جن کا اندازہ چشم بصیرت یا عارفانہ حیرت ہی کر سکتی ہے:

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ — ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

اسی مضمون کو مرزا غالب نے اپنے انداز میں پیش کیا ہے:

واقف نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ عارفانہ حیرت "ایمان بالغیب" کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ احساسِ سرّیت حیات، احساسِ وسعتِ عالمِ غیب کا نام ہے۔ ہمارے ہاں حکیمانہ مزاج کے صوفیائے کبار نے عارفانہ حیرت ہی کو علم کا انجام قرار دیا ہے۔

عارف رومی کہتے ہیں: علم را بفروش و حیرانی بخر کیونکہ محض علم سے پندار پیدا ہوتا ہے اور حیرت سے نظر میں وسعت و اضافہ ہوتا ہے۔ عطار کا یہ قطعہ بھی نہایت درجہ عارفانہ اور حکیمانہ ہے

کاملے گفت است می باید بسے عقل و حکمت، تا شود گویا کسے
باز باید عقلِ بے حد و شمار تا شود خاموش یک حکمت شعار

مگر یہ خاموشی پھر آبستن حقائق ہو جاتی ہے اور اس سے ایک نئی سطح کی گویائی نمودار ہوتی ہے جس کے اندر عجز بھی ہوتا ہے اور اقرار بھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انکار و پندار ناپید ہو جاتے ہیں اور "ایمان بالغیب" سے معرفت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کسی انسان کے اندر یہ خیال کہ میں عرفانِ حقیقت کے منتہا پر پہنچ گیا ہوں اس پر مزید ترقی کے راستے بند کر دیتا ہے اسی لیے عارف رومی یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ ہستی لامتناہی ہے کسی ایک مقام کو آخری منزل سمجھ کر اس پر ڈیرہ نہ ڈال دینا

اے برادر بے نہایت در گہیست ہر چہ بر وے می رسی بر وے مایست

معرفت کوش انسان میں کبھی انکار، پندار اور استکبار پیدا نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے انہیں صفاتِ حیات کش کو ابلیسیت قرار دیا ہے۔ روحیت اور الوہیت کو حیات و کائنات کی اساس سمجھنے والا ایک قسم کی لاادریت کے باوجود معرفت میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ عقل و ادراک اور انسانی تجربات سے حاصل شدہ معلومات کو وہ کبھی حقیقتِ کلی کا مرادف نہیں سمجھتا۔ ایک عظیم الشان نبی بھی جس پر معرفت کے کئی دروازے کھول دیے گئے وہ بھی علی الاعلان اقرار کرتا ہے کہ ما عرفناک حق معرفتک علم ہستی ہی کا ہوتا ہے۔ اگر ہستی لامتناہی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ انسان کا علم کسی ایک منزل پر بھی پوری ہستی پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے ایک طرف ہستی کے لامحدود ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور دوسری طرف علم کے محدود ہونے کا احساس بھی انسان کو دلایا ہے۔ کلماتِ الٰہی جن سے آفرینش و بقائے حیات و کائنات ہے ان کے لامحدود ہونے کی نسبت فرمایا گیا کہ اگر تمام سمندر لکھنے کی روشنائی بن جائیں اور تمام جہان کے درختوں سے قلم بنائے جائیں تو بھی ان کلمات کی مکمل فہرست نہ بن سکے۔

ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمت اللہ (۳۱: ۲۷)

اور اگر زمین کے سارے درخت قلم بن جائیں اور سمندر بلکہ اس کے علاوہ سات سمندر اور بھی سیاہی بن جائیں تب بھی "کلمات اللہ" ختم نہ ہوں گے۔

اور علم کی نسبت فرمایا کہ:

وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً (تمہیں بہت کم علم دیا گیا ہے۔)

خدا اپنے فیض سے غیب کے حقائق حسب سعی و توفیق اور حسب ضرورت اپنے خاص بندوں پر منکشف کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہ انکشاف بھی جزئی ہوتا ہے اس لیے کوئی عارف باللہ یا نبی محترم مطلقاً عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بہت کچھ جو عوام کے لیے غیب ہوتا ہے خواص کے لیے شہود اور تجربہ بن جاتا ہے۔ لیکن خواص کے آگے ہمیشہ بہت کچھ غیب باقی رہتا ہے اس لیے ایمان بالغیب کی ضرورت وہاں بھی ہے۔

مادیت پرست اور مظاہر پرست جبری بھی ہوتا ہے اس کو طبیعی مظاہر میں ہر جگہ جبر ہی جبر دکھائی دیتا ہے۔ مادی مظاہر کی فطرت فطرتِ مجبور ہے۔ سیارے اپنے مداروں میں ریاضیاتی جبر کے ماتحت گردش کرتے ہیں۔ ہوائیں اپنی مرضی سے اپنا رُخ نہیں بدل سکتیں۔ پانی اپنی مرضی سے نشیب کی بجائے فراز کی طرف نہیں بہ سکتا۔ مادی مظاہر کی تقدیر متعین اور اٹل ہے۔ عقل جو مظاہر فطرت سے قوانین اخذ کرتی ہے وہ بھی اس جبری فطرت کی آئینہ دار ہے اسی لیے ازروئے عقل اگر اختیار کو ثابت کرنا چاہیں تو یہ کوشش کبھی بارآور نہیں ہو سکتی کیونکہ عقل کا وظیفہ ہی یہی ہے کہ وہ ایک طرف مظاہر فطرت میں اور دوسری طرف استدلال میں لزوم کی کڑیاں تلاش کرے۔ جن لوگوں نے دین کے اندر بھی محض عقلِ استدلالی سے کام لیا ہے وہ خدا کے عطا کردہ اختیار انسانی کو ثابت نہیں کر سکے اور ہمیشہ کسی نہ کسی رنگ میں جبر ہی پر پہنچے ہیں۔ چنانچہ متکلمین میں اشاعرہ اسی لیے جبری ہو گئے۔ انہوں نے عقیدۂ کسب کے پردے میں جبر کو چھپانا چاہا لیکن جبر چھپ نہ سکا۔ صحیح عقیدہ وہی مسلمہ اسلامی عقیدہ تھا کہ الایمان بین الجبر والاختیار۔ انسان طبیعی فطرت سے مطلقاً الگ نہیں ہو سکتا اس لیے اس کے باہر اور اس کے اندر بھی جبر کے بہت سے مظاہر موجود ہیں لیکن انسان کی امتیازی خصوصیت خدا کا عطا کردہ اختیار ہے جو طبیعی فطرت کی علت و معلول کی کڑیوں سے الگ چیز ہے یہ احساس اختیار انسان کے وجدانِ حیات میں داخل ہے۔ اگر مظاہر فطرت اور مظاہر شناس حکمت طبیعی اس کے اقرار کے لیے دلائل مہیا نہیں کر سکتے تو اس سے اختیار باطل نہیں ہو جاتا کیونکہ زندگی مظاہر فطرت اور منطق سے وسیع تر اور عمیق تر ہے۔ زندگی کا یہی باطنی وجدان فطرت اور عقلِ مظاہر شناس کے مقابلے میں عالم غیب میں ہے۔ جو کچھ عالم شہود میں آجائے گا وہ جبر اور منطق و ریاضیات کی کڑیوں میں پرو دیا جائے گا۔ اسی وجہ سے مادیت والے تمام فلاسفہ جبری ہیں مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ بعض منطق گھمانے والے حامیانِ دین بھی جبر ہی کی تعلیم دیتے چلے آئے ہیں۔ علم الکلام کے علاوہ اس تعلیم کا اثر ہمارے بھٹکے ہوئے تصوف پر بھی پڑا اور تصوف کے راستے سے ہماری شاعری میں بھی دخیل ہو گیا۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا (میر)
جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں — سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں (آزاد)

فارسی متصوفانہ شاعری بھی اس خیالِ باطل سے لبریز ہے۔ اسلامی تعلیم اور شاعری میں اس کے خلاف شدید جہاد پہلے عارفِ رومی نے اپنی مثنوی میں کیا اور زمانۂ حال میں علامہ اقبال نے بھی نہایت زور سے جبر کے خلاف احتجاج کیا۔ قصۂ ابلیس و آدم میں ہم دیکھتے ہیں کہ آدم نے تو اپنی لغزش کا اقرار کیا کہ میں معافی کا خواستگار ہوں میں نے اپنے اختیار کو غلط برتا۔ لیکن مادیت اور اس سے وابستہ عقلیت کے مظہر ابلیس نے خلافِ ورزیٔ حکمِ الٰہی کا الزام خود خدا پر دھرا اور کہا کہ اگر میں گمراہ ہوا ہوں تو قادرِ مطلق ہونے کی وجہ سے تو نے ہی مجھے گمراہ کیا۔ آدم اختیار کا اقرار کرتے ہوئے معافی مانگتا ہے لیکن ابلیس اپنی مادیت کی وجہ سے جبر کی پناہ لیتا ہے۔

فہرست عنوانات

ایمان یقین بے دلیل کا نام ہے۔

ہر ایمان، ایمان بالغیب ہے۔ جو کچھ ابھی تجربے میں یا معرضِ شہود میں نہیں آیا اس کی حقیقت کا یقین۔ امید کا طبعی میلان جو انسان میں موجود ہے اس کا نام ایمان ہے۔ دنیا بہ امید قائم عام محاورہ ہے اور ایمان آخرت بہ امید قائم محض ممکنات کی نسبت احتمالِ ضعیف یا احتمالِ قوی ہو سکتا ہے مگر اس کو ظنی فلسفہ کہہ سکتے ہیں ایمان نہیں کہہ سکتے محض نقل یا سند کی بنا پر کچھ یقین کر لینے کا نام ایمان نہیں۔ رسول کریمؐ نے بھی محض دوسرے انبیاء کو سند قرار دے کر ایمان حاصل نہیں کیا۔ بعض اکابر انبیاء کی تعلیم ــــ وہ قبل وحیِ قرآن بھی آگاہ تھے۔ مگر اس دور کی نسبت قرآن کہتا ہے کہ تم کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔

جب کسی کا مذہب کی بنا محض نقل و سند کے سوا کچھ نہیں رہتی تو وہ مذہب کمزور اور بے اثر ہو جاتا ہے۔ روحانیات میں تقلید کو مولانا روم نے بہت بودا عمل قرار دیا ہے

ایمان اور عشق کا باہمی واسطہ۔ عشق کے اندر جو شدید تمنا ہے کیا وہ ایمان آفریں ہوتی ہے؟

زمان و مکان میں محدود حاضر کو کل حقیقت سمجھ کر اس پر فتویٰ نہ لگانا بلکہ اس کو ایک وسیع تر کل کا جزو سمجھ کر کوئی رائے قائم کرنا۔

عقل، ارادہ اور جذبات نفسِ انسانی کے تینوں عناصر ایمان میں یک جا پائے جاتے ہیں۔ ایمان کا تعلق

انسانی تجربے سے۔

صبر ایمان کا لازمی جزو ہے۔ تواصوا بالحق و تواصوا بالصبر۔

ایمان عقل کا پر پرواز ہے۔ عقل محسوسات و معقولات سے رشتہ بہ پا، پا بہ زنجیر زمین پیمائی کرتی اور دھیرے دھیرے پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے۔

ایمان پر عمل کرنے کے لیے عقل درکار ہے لیکن عقل کی قوتیں بغیر ایمان کے نہ محرک عمل ہو سکتی ہیں اور نہ جذبہ آفریں

اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء

ایمان انبیائے عظام و اولیائے کرام میں جبلّی اور وہبی ہوتا ہے یا شدید تلاش حق اور کارزار نفس کے بعد یہ فیضان حاصل ہوتا ہے۔

تاریخ انسانی میں تمام بڑے کارنامے کسی نہ کسی قسم کے ایمان کی بدولت ظہور میں آئے ہیں۔ ایمان کی قوت ہی نے ناپید کو پیدا اور مستور کو ظہور بخشا ہے۔

ایمان زندگی کی تخلیقی قوتوں کا نام ہے۔ تخلیق بھی اسی کی بدولت ہے اور بقا کا ضامن بھی یہی ہے۔

کسی چیز پر جتنا ایمان ہوتا ہے اسی نسبت سے انسان اس کے حصول و بقا میں قوتیں صرف کرتا ہے۔ اگر کسی معاملے میں انسان کا عمل مذبذب اور ربودا ہے تو یہ قطعی ثبوت اس امر کا ہے کہ اس کی تہہ میں جو ایمان ہے وہ استوار نہیں۔

انسان زندگی کا راستہ ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ ایمان کی آنکھوں سے طے کرتا ہے۔ اگر ایمان غلط ہے تو انسان غلط راہوں پر گامزن ہو کر فلاح حقیقی کو کھو بیٹھے گا۔

غلط ایمان کے ساتھ صراط مستقیم پر چلنا محال ہے۔

ایمان ایک مرتبہ حاصل ہو کر خود بخود قائم رہ سکتا ہے یا جسم کی طرح اس کو بھی اپنی بقا کے لیے مسلسل غذا کی ضرورت ہے۔

عمل کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے۔ اگر ایمان درست ہے تو عمل کے نتائج اس کو تقویت بخشتے ہیں۔ اس لیے یہ کہہ سکتے ہیں ایمان سے عمل اور عمل سے ایمان پیدا ہوتا ہے۔

مصائب حیات کے حملوں میں ایمان ڈھال کا کام دیتا ہے (حدیث)

یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا ایمان اس کی زندگی کے تمام شعبوں میں جاری و ساری اور اس کے تمام محسوسات و تجربات پر حاوی ہو لیکن نہ اس کی کوئی منطقی توجیہہ ہو سکے اور نہ کوئی واضح بیان۔

یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف افراد اور ملتیں اپنے ایمان کو مختلف انداز میں بیان کریں لیکن بنیادی حقیقت سب

میں مشترک ہو۔

ایمان جبر سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایمان کے بارے میں جبر حرام ہے خواہ وہ جبر خفی ہو یا جلی۔ یہ ایمان کی خامی ہے کہ اس کے لیے جبر کو روا رکھا جائے۔

صحیح انعام کا خوری انعام یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے بالاتر کر دیتا ہے۔ اسلام میں نجات کا یہی مفہوم ہے۔

ہر اس ایمان میں صداقت کا جزو موجود ہوتا ہے جس نے انسان کے لیے کسی قسم کی ظاہری یا باطنی فلاح پیدا کی ہے۔ ایمان فلاح ہی کی دعوت ہے۔

ایمان استوار ہو کر ایک جذبہ انگیز اور خلاق وجدانِ حیات بن جاتا ہے۔

ایمان سے زندگی میں وقار پیدا ہوتا ہے۔ اور تکریم آدم کا یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ اور انسان محسوس کرتا ہے کہ میں مادیات و محسوسات و معقولات سے بلند تر مخلوق ہوں۔

اسلامک آئیڈیالوجی

مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اسلام کے مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی اصولوں کا دوسرے نظریات سے اور اسلامی نظریۂ حیات کا دوسرے نظام ہائے فکر سے مقابلہ کر کے ایک طرف تو مغربی دنیا کو دعوتِ فکر و نظر دی گئی ہے اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو جمود و بے حسی اور تقلید پرستی کے طلسم توڑ کر اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ قیمت بارہ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور